سُود کے متعلق چند اہم مباحث

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کا سوالنامہ اور اس کا جواب

(۲)

دوسرا سوال لفظ ربٰو کے معنی لغتِ عرب میں تو زیادتی، اضافے اور بڑھوتری کے ہیں، لیکن "الربٰو" سے اصطلاحاً جو چیز مراد ہے وہ خود قرآن ہی کے اِن الفاظ سے صاف ظاہر ہو جاتی ہے

وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا ... وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ... وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ۔ (۲: ۲۷۸-۲۸۰)

سود میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو ... اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں اپنے راس المال لینے کا حق ہے ... اور اگر تمہارا دین دار تنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو۔

یہ الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ربٰو کا یہ حکم قرض کے معاملہ سے متعلق ہے اور قرض میں اصل سے زائد جو کچھ طلب کیا جائے وہ الربٰو ہے جسے چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن یہ کہہ کر بھی ربٰو کا مفہوم واضح کرتا ہے کہ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (اللہ نے بیع کو حلال اور ربٰو کو حرام کیا ہے)۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ربٰو میں راس المال سے زائد جو کچھ لیا جاتا ہے وہ اس منافعہ سے مختلف ہے جو بیع کے معاملہ میں لاگت سے زائد حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ربٰو مال کی وہ زیادتی ہے جو بیع کے طریقے سے نہ ہو۔ اسی بنا پر محدثین، فقہاء اور مفسرین کا پورا اتفاق ہے کہ قرآن میں وہ ربٰو حرام کیا گیا ہے جو قرض کے معاملہ میں اصل سے زائد طلب کیا جائے۔

نزولِ قرآن کے وقت یہ امر عرب میں پوری طرح معلوم و معروف تھا کہ قرض کا معاملہ

صرف شخصی حاجات ہی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ کاروباری اور قومی اغراض کے لیے بھی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود قرآن نے نہ اس آیت میں، نہ کسی دوسری آیت میں، ایسا کوئی اشارہ کیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہو کہ اغراض کے اعتبار سے قرض اور قرض میں کوئی فرق ہے اور سود کی حرمت کا یہ حکم صرف شخصی حاجات کے قرضوں کے لیے مخصوص ہے۔ فقہاء اسلام بھی پہلی صدی ہجری سے آج تک اس اصول پر متفق رہے ہیں کہ كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ بِهٖ نَفْعًا فَهُوَ رِبًوا (ہر قرض جس کے ساتھ نفع حاصل کیا جائے، ربا ہے)۔ قریب کے زمانہ سے پہلے فقہاء کی اس متفقہ رائے سے اختلاف کی کوئی ایک مثال بھی تاریخ فقہ سے نکال کر پیش نہیں کی جا سکتی۔

تیسرا سوال ربا اور ربح میں فرق یہ ہے کہ ربا، قرض پر مال دے کر اصل سے زائد وصول کرنے کا نام ہے۔ اور اس کے برعکس ربح سے مراد بیع میں لاگت (COST PRICE) سے زائد قیمتِ فروخت حاصل کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں خسارہ کا لفظ بولا جاتا ہے جبکہ لاگت سے کم پر کسی شخص کا مال فروخت ہو۔ لسان العرب میں ربح کے معنی یہ لکھے ہیں:

الرِّبْح والرَّبَح والرَّباح النماء فی التجر... والعرب تقول ربحت تجارته اذا ربح صاحبها فیها... وقوله تعالیٰ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ [1]

تجارت میں افزونی کو ربح اور ربَح اور رباح کہتے ہیں... عرب کہتے ہیں ربحت تجارته جبکہ تجارت کرنے والا نفع کماتے... اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فما ربحت تجارتهم

مفردات امام راغب میں ہے:

الربح الزیادۃ الحاصلۃ فی المبایعۃ

ربح وہ زیادتی ہے جو خرید و فروخت کے معاملہ میں حاصل ہو۔

قرآن مجید خود بھی ربٰو اور تجارتی منافع کا فرق بیان کرتا ہے۔ کفار عرب حرمت سود کے خلاف جو اعتراض پیش کرتے تھے وہ یہ تھا کہ انما البیع مثل الربٰو۔ یعنی بیع میں اصل لاگت

[1] طبع بیروت، ج ۷، ص ۴۴۲۔

سے زائد جو قیمت زرِ حق وصول کی جاتی ہے وہ بھی تو آخر اسی طرح ہے جس طرح قرض کے معاملہ میں اصل راس المال سے زائد ایک رقم لی جاتی ہے۔ قرآن نے اس کے جواب میں صاف کہا کہ اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ "اللہ نے بیع کو حلال کیا اور ربا کو حرام کیا ہے" یعنی دولت میں اضافہ بصورتِ بیع اور چیز ہے اور بصورتِ قرض اور چیز۔ ایک کو خدا نے حلال کیا ہے اور دوسرے کو حرام۔ کوئی شخص منافع چاہتا ہو تو اس کے لیے یہ دروازہ کھلا ہے کہ خود بیع کا کاروبار کرے یا کسی دوسرے کے ساتھ اس میں شریک ہو جائے لیکن قرض دے کر منافعہ طلب کرنے کا دروازہ بند ہے۔

چوتھا سوال ربا کی تعریف یہ ہے کہ "قرض کے معاملہ میں اصل سے زائد جو کچھ طلب کیا اور بطورِ شرطِ معاملہ دیا جائے وہ ربوٰا ہے" اس تعریف میں اس سوال کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے کہ یہ ربا قرض دینے والے نے طلب کیا یا قرض لینے والے نے از خود پیش کیا۔ یہ سوال ربوٰا کی قانونی تعریف میں غیر موثر ہے اور قرآن سے یا کسی صحیح حدیث سے اس امر کا کوئی اشارہ تک نہیں نکلتا کہ اگر سود قرض لینے والے کی طرف سے پیش کیا جائے تو اس سے اس کے سُود ہونے اور حرام ہونے میں کوئی فرق واقع ہو گا۔ علاوہ بریں کوئی صاحبِ عقل دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے نہ کبھی پایا گیا ہے جسے اگر سُود کے بغیر قرض مل سکتا ہو تب بھی وہ سود ادا کرنے کی شرط اپنے طور پر پیش کرے۔ قرض لینے والے کی طرف سے یہ شرط تو اسی صورت میں پیش ہو سکتی ہے جبکہ کہیں سے اس کو بلا سود قرض ملنے کی امید نہ ہو۔ اس لیے سود کی تعریف میں اس کو غیر مُؤثر ہونا ہی چاہیے۔

مزید براں بینکوں کی طرف سے قدیم زمانہ میں بھی اور آج بھی امانت رکھے ہوئے روپے پر سُود اس لیے پیش کیا جاتا تھا اور کیا جاتا ہے کہ اس لالچ سے لوگ اپنی جمع شدہ دولت ان کے حوالہ کریں اور پھر وہ کم شرحِ سود پر لی ہوئی دولت آگے زیادہ شرح سود پر قرض دے کر فائدہ اٹھائیں۔ اس طرح کی پیش کش اگر سود دینے والے کی طرف سے ہوتی ہے تو حرمتِ سُود کے مسئلے میں اس کے قابلِ لحاظ ہونے کی آخر کیا معقول وجہ ہے۔ امانتوں پر جو سود دیا جاتا ہے اس کی نوعیت دراصل یہ ہے کہ وہ اس سود کا ایک حصہ ہے جو انہی امانتوں کو شخصی، کاروباری اور ریاستی

قرضوں کی تشکیل میں دیکر وصول کیا جاتا ہے۔ یہ تو اسی طرح کا حصہ ہے جیسے کوئی شخص نقب زنی کے آلات کسی سے لے اور جو کچھ چوری کا مال اسے حاصل ہو اس کا ایک حصہ اس شخص کو بھی دے دے جس نے اسے یہ آلات فراہم کر کے دیے تھے۔ یہ حصہ اس دلیل سے جائز نہیں ہو سکتا کہ حصہ دینے والے نے بخوشی اسے دیا ہے، لینے والے نے جبر سے نہیں دیا ہے۔

پانچواں سوال | بیع سلم دراصل پیشگی سودے کی ایک صورت ہے یعنی ایک شخص دوسرے شخص سے آج ایک چیز خرید کر اس کی قیمت ادا کر دیتا ہے، اور ایک وقت مقرر کر دیتا ہے کہ بائع وہ چیز اس وقت خاص پر اسے دیگا۔ مثلاً میں ایک شخص سے کپڑے کے سو تھان آج خریدتا ہوں اور ان کی قیمت ادا کر دیتا ہوں اس شرط کے ساتھ کہ یہ تھان میں چار مہینے کے بعد اس سے لونگا۔ اس سودے میں چار باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ مال کی قیمت سودا طے ہونے کے وقت ہی ادا کر دی جاتے۔ دوسرے یہ کہ مال کی صفت (quality) واضح طور پر معین ہو تاکہ بائع اور مشتری کے درمیان اس کی صفت کے بارے میں کوئی چیز مبہم نہ رہے جو وجہ نزاع بن سکے تیسرے یہ کہ مال کی مقدار بھی وزن، یا ناپ یا تعداد وغیرہ کے لحاظ سے ٹھیک ٹھیک معین ہو۔ اور چوتھے یہ کہ مال خریدار کے حوالہ کرنے کا وقت معین ہو اور اس میں بھی کوئی ابہام نہ ہو کہ وہ نزاع کا سبب بنے۔ اس سودے میں جو پیشگی قیمت دی جاتی ہے اس کی نوعیت ہرگز قرض کی نہیں ہے بلکہ وہ ویسی ہی قیمت ہے جیسی دست بدست بین دین میں خریدار ایک چیز کی قیمت ادا کرتا ہے۔ فقہ میں اس کا نام بھی ثمن ہے نہ کہ قرض۔ وقت معین پر مال کی عدم تحویل یا کسی اور سبب سے اگر بیع فسخ ہو جائے تو مشتری کو صرف اصل قیمت لوٹائی جاتی ہے۔ کسی شے زائد کا وہ حقدار نہیں ہوتا۔ اس میں اور عام بیع میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہے کہ عام بیع میں مشتری بائع سے اپنی خریدی ہوئی چیز دست بدست لے لیتا ہے اور بیع سلم میں وہ اس کا قبضہ لینے کے لیے آئندہ کی ایک تاریخ مقرر کر دیتا ہے۔ اس معاملہ کو قرض اور سود کے مسئلے سے خلط ملط کرنے کی کوئی معقول وجہ میں نہیں سمجھ سکا۔ سوال میں جس کی جو مثال

بیان کی گئی ہے وہ بالکل غیر واضح ہے اور اس پر کوئی کلام ممکن نہیں۔ لبطاہر جس شکل میں یہ مثال بیان کی گئی ہے وہ دراصل شرکت کی شکل ہے یعنی بھینس ایک شخص کی اور اس پر کام دوسرا شخص کرے اور دودھ دونوں کے درمیان تقسیم ہو جاتے۔

چھٹا سوال | ہم جنس اشیاء کے دست بدست تبادلے میں تفاضُل کو حرام قرار دینے کا مقصد جیسا کہ ابن قیم اور دوسرے لوگوں نے بیان کیا ہے، دراصل سدّ باب ذریعہ ہے یعنی اصل حرام تو ربوا النسیئہ (قرض کا سود) ہے لیکن زیادہ ستانی کی ذہنیت کا قلع قمع کرنے کے لیے ہم جنس اشیاء کے دست بدست تبادلہ میں بھی تفاضُل کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ایک ہی جنس کی اشیاء مثلاً چاول کا تبادلہ چاول سے صرف اسی صورت میں کیا جاتا ہے جبکہ اس کی ایک قسم بڑھیا ہو اور دوسری گھٹیا۔ شارع کا منشا یہ ہے کہ بڑھیا قسم کے ایک سیر چاول کا تبادلہ گھٹیا قسم کے مثلاً سوا سیر چاول سے نہ کیا جاتے، خواہ ان دونوں کی بازاری قیمت کا فرق اتنا ہی ہو۔ بلکہ ایک شخص اپنے چاول مثلاً روپے کے عوض فروخت کر دے اور دوسرے چاول روپے کے عوض ہی خرید لے۔ براہِ راست چاول کا چاول سے تفاضُل کے ساتھ مبادلہ کرنے میں اس ذہنیت کو غذا ملتی ہے جو سود خواری کی اصل جڑ ہے اور شارع اسی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ فقہائے دنیا نے سود کے مسئلے میں جتنے بھی اختلافات ہوتے ہیں وہ صرف ربوٰ الفضل کے معاملہ میں ہیں کیونکہ اس کی حرمت کے احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر زمانہ میں دیئے تھے اور آپ کی حیاتِ طیبہ میں معاملات پر ان احکام کے انطباق کی شکلیں پوری طرح واضح نہ ہو سکی تھیں لیکن جہاں تک ربوا النسیئہ (قرض کے معاملہ میں اصل سے زائد لینے) کا تعلق ہے، اس کی حرمت اور اس کے احکام میں فقہا کے درمیان پورا اتفاق ہے۔ یہ ایک صاف مسئلہ ہے جس میں کوئی الجھن نہیں ہے۔

ساتواں سوال | تجارت میں طرفین کی رضامندی ضرور لازم ہے لیکن یہ تجارت کے حلال ہونے کی علت ہے، نہ اس کا عدم سُود کے حرام ہونے کی علت۔ قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ سُود اس لیے حرام کیا جاتا ہے کہ دینے والا اسے بادلِ ناخواستہ مجبوراً دیتا ہے۔ اگرچہ دنیا میں کوئی

سود بھی برضا و رغبت نہیں دیا جاتا، اور بلا سود قرض ملنے کا امکان ہو تو کوئی شخص قرض پر سود نہ دے۔ لیکن اس چیز کی حرمت کے مسئلے میں رضامندی اور نارضامندی کا سوال بالکل غیر متعلق ہے، کیونکہ قرآن مطلقاً اس قرض کو حرام قرار دیتا ہے جس میں راس المال سے زائد ادا کرنے کی شرط شامل ہو، قطع نظر اس سے کہ یہ شرط تراضی طرفین سے طے ہوئی ہو یا کسی اور طرح۔

رہی یہ بحث کہ سودی قرض کی حرمت میں اصل علت ظلم ہے، اور جس قرض پر سود وصول کرنے میں ظلم نہ ہو وہ حلال ہونا چاہیے، اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ قرآن نے اس امر کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے کہ آپ اس کے الفاظ سے صرف "ظلم" کا علت حرمت ہونا نکال لیں اور پھر اس لفظ ظلم کا مفہوم خود جس طرح چاہیں مشخص کریں۔ قرآن جس جگہ یہ علتِ حرمت بیان کرتا ہے اسی جگہ وہ خود ہی ظلم کا مطلب بھی واضح کر دیتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ... وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ۔ (۲: ۲۷۸-۲۷۹)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو وہ سود جو لوگوں کے ذمہ باقی رہ گیا ہے اگر تم مومن ہو ... اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں اپنے راس المال لینے کا حق ہے۔ نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

یہاں دو ظلموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک وہ جو دائن مدیون پر کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو مدیون دائن پر کرتا ہے۔ مدیون کا دائن پر ظلم، جیسا کہ آیت کے سیاق و سباق سے صاف ظاہر ہوتا ہے، یہ ہے کہ اس کا دیا ہوا اصل راس المال بھی مدیون واپس نہ کرے۔ بالکل اسی طرح مدیون پر دائن کا ظلم جو اس آیت کے سیاق و سباق سے بین طور پر ظاہر ہو رہا ہے، یہ ہے کہ وہ اصل راس المال سے زائد اس سے طلب کرے۔ اس طرح قرآن یہاں اس ظلم کے معنی خود متعین کر دیتا ہے جو قرض کے معاملہ میں دائن و مدیون ایک دوسرے پر کرتے ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے انصاف یہ ہے کہ دائن مدیون سے صرف راس المال واپس لے، اور ظلم یہ کہ وہ راس المال سے زیادہ وصول کرے

قرآن کا یہ سیاق و سباق اپنے مفہوم میں اس قدر واضح ہے کہ ابن عباس اور ابن زید سے لیکر پچھلی صدی کے شوکانی اور آلوسی تک تمام مفسرین نے اس کا یہی مطلب لیا ہے۔ اس پوری مدت میں کوئی ایک مفسر بھی ایسا نہیں پایا جاتا جس نے قرآن سے صرف ظلم کا لفظ حرمتِ ربوا کی علت کے طور پر نکال لیا ہو اور پھر ظلم کے معنی باہر کہیں سے لینے کی کوشش کی ہو۔ یہ بات اصولاً بالکل غلط ہے کہ ایک عبارت کے اپنے سیاق و سباق سے اس کے کسی لفظ کا جو مفہوم ظاہر ہوتا ہو اسے نظر انداز کر کے ہم اپنی طرف سے کوئی معنی اس کے اندر داخل کریں۔

اس سوال کے سلسلے میں یہ دعویٰ جو کیا گیا ہے کہ کمرشل انٹرسٹ میں کسی پارٹی پر بھی ظلم نہیں ہوتا، یہ بھی ہمیں تسلیم نہیں ہے۔ کیا یہ ظلم کچھ کم ہے کہ ایک شخص قرض پر سرمایہ دیکر تو ایک خاص منافعہ کی ضمانت حاصل کر لے، مگر جو لوگ کاروبار کو پروان چڑھانے کے لیے وقت محنت اور ذہانت صرف کریں ان کے لیے سرے سے کسی منافعہ کی کوئی ضمانت نہ ہو، بلکہ نقصان ہونے کی صورت میں بھی وہ دائن کو اصل مع سود دینے کے ذمہ دار رہیں؟ تمام خطرہ (RISK) محنت اور کام کرنے والے فریق کے حصے میں، اور خالص منافعہ روپیہ دینے والے فریق کے حصہ میں، یہ آخر انصاف کیسے ہو سکتا ہے۔ اس لیے سود بہر حال ظلم ہے، خواہ وہ شخصی حاجات کے قرضوں میں ہو یا کاروباری اغراض کے قرضوں میں۔ انصاف چاہتا ہے کہ اگر آپ قرض دیتے ہیں تو آپ کو صرف اپنا راس المال واپس ملنے کی ضمانت حاصل ہو۔ اور اگر آپ کاروبار میں روپیہ لگانا چاہتے ہیں تو پھر شریک کی حیثیت سے روپیہ لگائیے۔

آٹھواں سوال اس سوال کا تفصیلی جواب میں اپنی کتاب "سود" میں دے چکا ہوں۔ یہاں مختصر جواب عرض کرتا ہوں۔

(الف) صنعتی اداروں کے معمولی حصے بالکل جائز ہیں بشرطیکہ ان کا کاروبار بجائے خود حرام نوعیت کا نہ ہو۔

(ب) ترجیحی حصص، جن میں ایک خاص منافعہ کی ضمانت ہو، سود کی تعریف میں آتے ہیں اور ناجائز ہیں۔

(ج) بینکوں کے فکسڈ ڈپازٹ کے متعلق دو صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں:

جو لوگ صرف اپنے روپے کی حفاظت چاہتے ہوں اور اپنا روپیہ کسی کاروبار میں لگانے کے

خواہشمند نہ ہوں، ان کے روپے کو بینک "امانت" رکھنے کے بجائے "قرض" لیں، اسے کاروبار میں لگا کر منافعہ حاصل کریں، اور ان کا اصل راس المال مدت مقررہ پر ادا کر دینے کی ضمانت دیں۔

اور جو لوگ اپنے روپے کو بینک کی معرفت کاروبار میں لگوانا چاہیں، ان کا روپیہ "امانت" رکھنے کے بجائے بینک ان سے ایک عام شراکت نامہ طے کرے، ایسے تمام اموال کو مختلف قسم کے تجارتی، صنعتی، زراعتی یا دوسرے کاموں میں، جو بینک کے دائرہ عمل میں آتے ہوں، لگائے، اور اس مجموعی کاروبار سے جو منافعہ حاصل ہو، اسے ایک طے شدہ نسبت کے ساتھ ان لوگوں میں اسی طرح تقسیم کرے جس طرح خود بینک کے حصہ داروں میں منافعہ تقسیم ہوتا ہے۔

(د) بینکوں سے لیٹر آف کریڈٹ کھلوانے کی مختلف صورتیں ہیں جن کی شرعی پوزیشن جداگانہ ہے۔ جہاں بینک کو محض ایک اعتماد نامہ دینا ہو کہ یہ شخص بھروسے کے قابل ہے، وہاں بینک جائز طور پر صرف اپنے دفتری اخراجات کی فیس لے سکتا ہے۔ اور جہاں بینک دوسرے فریق کو رقم ادا کرنے کی ذمہ داری لے، وہاں اسے سُود نہیں لگانا چاہیے۔ اس کے بجائے مختلف جائز طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں کاروباری لوگوں کی جو رقمیں رہتی ہیں، ان پر کوئی سود نہ دیا جائے بلکہ حساب کتاب رکھنے کی اُجرت لی جائے، اور ان رقموں کو قلیل المیعاد قرضوں کی صورت میں کاروباری لوگوں کو بلا سُود دیا جائے۔ ایسے قرض داروں سے بینک اس رقم کا سود تو نہ لیں، البتہ اپنے دفتری اخراجات کی فیس ان سے لے سکتے ہیں۔

(ھ) حکومت خود، یا اپنے زیر اثر جتنے ادارے بھی قائم کرے ان سے سُود کے عنصر کو خارج ہونا چاہیے۔ اس کے بجائے دوسرے طریقے تھوڑی توجہ اور قوت اجتہاد سے کام لیکر نکالے جا سکتے ہیں جو جائز بھی ہوں اور نفع بخش بھی۔ اس طرح کے تمام اداروں کے بارے میں کوئی ایک جامع گفتگو چند الفاظ میں یہاں نہیں کی جا سکتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے حرام چیز کو حرام مان لیا جائے۔ پھر اس سے بچنے کا ارادہ ہو۔ اس کے بعد ہر کارپوریشن کے لیے ایک ایسی کمیٹی بنائی جائے جو اس کارپوریشن کے تمام کاموں کو نگاہ میں رکھ کر یہ دیکھے کہ اس کے مختلف کام کہاں کہاں حرام طریقوں سے ملوث ہوتے ہیں اور ان کا بدل کیا ہے جو اسلامی

احکام کی رُو سے جائز بھی ہو اور قابل عمل اور نفع بخش بھی۔ آخری چیز ہماری اس ذہنیت کی تبدیلی ہے کہ اہل مغرب کے جن پٹے ہوئے راستوں پر چلنے کے ہم پہلے سے عادی چلے آرہے ہیں انہی پر ہم آنکھیں بند کر کے چلتے رہنا چاہتے ہیں، اور سارا زور اس بات پر صرف کر ڈالتے ہیں کہ کسی طرح انہی راستوں کو ہمارے لیے جائز کر دیا جائے۔ ہماری سہولت پسندی ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم کچھ دماغ سوزی اور کچھ محنت کر کے کوئی نیا راستہ نکالیں۔ تقلیدِ جامد کی بیماری بدقسمتی سے ساری قوم کو لگی ہوئی ہے۔ نہ جبہ پوش اس سے شفا پاتے ہیں نہ سوٹ پوش۔

(۵) گورنمنٹ کے قرضے جہاں تک اپنے ملک سے حاصل کیے جائیں ان پر سود نہ دیا جائے۔ اس کے بجائے حکومت اپنے ایسے منصوبوں کو جن میں قرض کا روپیہ لگایا جاتا ہے کاروباری اصول پر منظم کرے اور ان سے جو نفع حاصل ہو اس میں سے ایک طے شدہ تناسب کے ساتھ ان لوگوں کو حصہ دیتی رہے جن کا روپیہ وہ استعمال کرتی ہے۔ پھر جب وہ مدت ختم ہو جائے جس کے لیے ان سے روپیہ مانگا گیا تھا اور ان لوگوں کا راس المال واپس کر دیا جائے تو آپ سے آپ منافعہ میں ان کی حصہ داری بھی ختم ہو جائیگی۔ اس صورت میں درحقیقت کوئی بہت بڑا تغیر کرنا نہیں ہوگا۔ متعین شرح سود پر جو قرض لیے جاتے ہیں، ان کو تبدیل کر کے بس متناسب منافعہ پر حصہ داری کی صورت دینی ہوگی۔

غیر ملکوں سے جو قرض لیے جاتے ہیں ان کا مسئلہ اچھا خاصا پیچیدہ ہے۔ جب تک پوری تفصیل کے ساتھ ایسے تمام قرضوں کا جائزہ نہ لیا جائے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی نوعیتیں کیا کیا ہیں اور ان کے معاملہ میں حرمت سے بچنے کے لیے کس حد تک کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اصولی طور پر جو بات میں کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمیں پہلے اپنی تمام توجہ اندرونِ ملک سے سود کو ختم کرنے پر صرف کرنی چاہیے اور بیرونِ ملک میں جہاں سُودی لین دین سے بچاؤ کی کوئی صورت نہ ہو وہاں اس وقت تک اس آفت کو برداشت کرنا چاہیے جب تک اس سے بچنے کی صورتیں نہ نکل آئیں۔ ہم اپنے اختیار کی حد تک خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اس حد تک اگر ہم گناہ سے بچیں تو مجبوری کے معاملہ میں ہم معافی کی امید رکھ سکتے ہیں۔